شہر کے دوسرے کنارے سے
احمد حسین مجاہد کی آواز

ڈاکٹر عابد سیال

احمد حسین مجاہد کی اِس کتاب میں موجود شاعری کے شہر میں داخلے کے کئی دروازے ہیں جن میں سے چند کتاب کی پہلی قرأت میں میرے ہاتھ لگے ہیں۔ ہر دروازے پر احمد ہی کا ایک شعر کندہ ہے اور ہر دروازے کے اندر کا محلہ ایک چھوٹی سی منفرد دنیا ہے ز، یہ چند سطور انھیں دروازوں کا تعارفیہ ہیں۔

شاعری کے اِس شہر میں داخلے کا ایک دروازہ وہ ہے جس پر احمد کا یہ شعر لکھا ہے؛

سیکھ لے تو بھی کوئی رمز، کوئی نکتہ کہ میں
وہ پڑھتا ہوں کتابوں میں جو تحریر نہیں

روایتوں میں اضافہ صرف معنی تک محدود نہیں، عمومی لسانی روش میں تبدیلی بھی اضافہ ہے۔ اِس کتاب میں کئی مقامات پر ایسی لسانی روش اختیار کی گئی ہے جو اِس سے پہلے کی کتابوں میں مرقوم نہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ احمد کہتے ہیں؛

دیکھے تری نظر کے ہزاروں مسودے
ہم حاشیے میں ہیں نہ کسی اقتباس میں

عموماً حاشیے کا متضاد متن ہے لیکن یہاں حاشیے کا متضاد اقتباس قرار دیا گیا ہے۔ متن اور حاشیہ عمومی اور ظاہری تضاد کو ظاہر کرتے ہیں، اقتباس متن میں بھی چنیدہ حصہ ہوتا ہے لہٰذا یہ تضاد کی بلند تر سطح ہے جہاں متن اور متن کے باہر کا تضاد نہیں بلکہ متن کے اندر اور متن کے اعلیٰ تر اور مرکزی مقام کا تضاد ہے، لہٰذا شعر میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تیری نظر میں ہم نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں، دوسرا یہ کہ نہ تو ہمیں نظر انداز کرتا ہے نہ منظورِ نظر بناتا ہے، ایک اضدادی جوڑے میں یہ ذرا سی اختراع امکانِ معنی کی کثرت کی راہ سجھاتی ہے۔

اِسی طرح اِس مجموعے کی ایک نظم 'ایک لامحدود' میں نیند میں پہنچنے کی ایک کیفیت کو نظمایا گیا ہے۔ 'لامحدود' لغت کے اعتبار سے صفت ہے جو اسم کا تقاضا کرتی ہے۔ احمد نے اسے اسم فراہم کرنے کی بجائے خود اسی کو اسم بنا دیا ہے، سو جو لفظ کسی اور اسم کی توصیف کے لیے استعمال میں تھا، اب خود صاحبِ توصیف ہے، جب احمد کہتا ہے؛

راحتِ محدود کا عادی بدن

بستر پہ چھوڑا

ایک لامحدود میں پہنچا

جہاں ہر چیز ممکن ہے

یہ مقامات باریک ہیں اور روا روی میں پڑھتے ہوئے شاید دھیان میں بھی نہ آئیں لیکن شاعر کی اختراعی طبیعت کی باریکی کے زاویے فراہم کرتے ہیں۔ یہ دو مثالیں تھیں، لفظ کے متعلقات کو تازہ کرنے کی روش احمد کی شاعری میں جا بجا موجود ہے۔

اِس دروازے کی سیر کے بعد باہر نکل کر کتاب کی فصیل کے ساتھ ساتھ کچھ آگے چلیے تو داخلے کا ایک اور دروازہ وہ ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے؛

کچھ کو نشاطِ غم ہے تو کچھ کو غمِ نشاط

ہم میں سے کوئی بھی نہیں اپنے حواس میں

شاعری کے اِس محلے میں شاعر اپنی بعض 'حرکتوں' سے نوٹ کرواتا ہے کہ وہ فنی سطح پر اپنا انسلاک کس نوع اور کس درجے کے شاعروں کے ساتھ رکھنا چاہ رہا ہے، مثلاً مجھے مجید امجد یاد آئے ؛

جو تُو ہے برقِ نشیمن تو میں نشیمنِ برق

الجھ گئے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

اِسی طرح اِس علاقے میں احمد کا یہ شعر؛

میں سحرِ آبروئے معانی کی کھوج میں

نکلا تو لفظِ کم سے بھی کچھ کم ہی رہ گیا

اور

ہزار نذر کرے اپنی کائنات کوئی

کسی کو بار نہ دوں بارگاہ میں اپنی

بتاتے ہیں کہ شاعر کو ان علاقوں میں جانا پسند ہے جہاں غالب کہتا ہے؛

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی

وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

یا

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

یا جیسے ہمارے زمانے میں خورشید رضوی کہتے ہیں؛

کشتی خدا پہ چھوڑ کے رنگ اُڑ گیا ہے کیوں
گویا خدا نہ ہوا ناخدا ہوا

یہ لفظ کو الٹ پلٹ کر اس کے مستور اور محجوب اور بعض اوقات متضاد معانی کھنگالنے کی کوشش بھی ہے اور تکرار کے جمال سے تنافر کی گدلاہٹ کی پہچان الگ کرنے کی سعی بھی۔ شاعری کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے یہ مقامات شاعر کے انفراد کو پہچاننے کی جگہیں ہیں۔

یہ سیر تمام کر کے اگلے دروازے کا قصد کریں تو اس پر یہ شعر لکھا ملتا ہے؛

خوشبو کی طرح گزر گیا ہے
وہ سب سے ہاتھ کر گیا ہے

شاعری کے اس محلے کی دنیا اظہار میں تجربے کی جرأت کی دنیا ہے۔ یہاں شاعر کے ہاں زبان کے ساتھ کچھ کھل کھیلنے کا رویہ ہے۔ عوامی زبان کو شاعری کے درجے پر فائز کرنے کی کوششیں ہیں، روزمرہ کے اظہارات کو روایتی احتیاط میں ملفوف کیے بغیر کلام کرنے کی روش ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے؛

میری آنکھوں سے جو ہو کر اس کے گھر تک جاتا ہے
اس رستے پر گھاس اگنے دوں یہ تو سیدھی گالی ہے

کوئی کہہ رہا ہے؛

میں جو کہتا ہوں کچھ نہیں ہو گا
آگ میں ڈال سب کی رائے کو

ایک مسلسل آواز یوں بھی ہے؛

اپنے ہی اسیر ہو گئے ہیں
لو! ہم بھی فقیر ہو گئے ہیں
اس شخص کا کیا بنے گا جس کے
ہم جیسے مشیر ہو گئے ہیں

گزری ہے جدائی کی بس اک رات
ہم سیدھے تیر ہو گئے ہیں
ایجاد ہوئے ہیں ایسے آلات
بوڑھے بھی شریر ہو گئے ہیں

یہ راہ شاعر کو عوامی مزاج سے قریب کرنے میں معاونت کرتی ہے۔ برانڈ کی دکانیں اپنی قیمتی مصنوعات کے ساتھ ذرا عوامی قیمت پر مشتمل دو چار آئٹم بھی دکان کے دروازے کے قریب سجا کے رکھتی ہیں جو ایسے گاہکوں کو کھینچتی ہیں جو اپنی جیب اور توفیق کو دیکھتے ہوئے شیشوں والی دکانوں میں داخل ہونے سے گھبراتے ہیں۔ اسی طرح ایسے اشعار جو عوامی لہجے میں گہری بات کریں، ایسے قارئین کو ادبِ عالیہ کے بلندتر مضامین واظہارات کی طرف کھینچ لاتے ہیں جو یہ سمجھ کر گریز پا تھے کہ صرف مشکل شاعری ہی اعلیٰ شاعری ہوتی ہے۔

شاعری کے فنی جہانوں سے لطف اندوزی کرتے ہوئے اگلے دروازے کی طرف قدم بڑھائیں تو وہ شعر آتا ہے جس نے اس کتاب کے قاری کو اپنا اسیر کرنے کے لیے سب سے پہلا طاقت ور حملہ کیا تھا۔ یہ کتاب کی پہلی غزل کا شعر ہے؛

یہی کہ چاہا کسی کو اور اس کو پا بھی لیا
لیا ہے کام محبت سے کتنا کم میں نے

یہ جہان محبت کے جذبے کی رعنائی، گیرائی، گہرائی اور پہنائی کے ملاحظے کا جہان ہے۔ محبت کے متنوع رنگ یہاں جلوہ گر ہیں، کہیں وارفتگی ہے؛

لپٹ گیا صفِ اعدا میں گھس کے یار سے میں
وہ زعم تھا مجھے لشکر نظر نہیں آیا

کہیں بعض کیفیتیں اس عشق کی ہیں جس کی جھلک میر نے دکھائی تھی کہ:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ہمارا شاعر یہاں کہتا ہے؛

جنوں میں یار سے آگے قدم نہ پڑ جائے
یہ عمر بھر کی ریاضت بھی کم نہ پڑ جائے

کہیں ایک دوسرے کا مقدر ہونے کی لطیف شکلیں ہیں؛

وہ میرے ہاتھ کی ریکھاؤں کا حسنِ تغیر ہے
ثباتِ عشق ہوں میں اس کی پیشانی میں رہتا ہوں

کہیں معاملہ بندی کی وہ صورتیں ہیں جو جذبہ محبت کو جسمانی سطح سے ترفع عطا کر کے روحانی معاملات تک لے جاتی ہیں۔اس میں وصال کی صورت بھی ارتفاعی ہے کہ:

انگلیوں کی مشعلوں میں لَو ہے اُس کے لمس کی
نور کا ہالہ کھنچا ہے آستیں کے آس پاس

اور فراق کے لمحے بھی زندگی کی تہذیب کاری کا سبب ہیں؛

بلا سبب نہیں مڑ مڑ کے دیکھنا میرا
پلٹ کے دیکھ! مجھے دیکھنے کا ڈھب آئے

اس سے اگلا دروازہ قریب ہی ہے۔اس دروازے پر لکھا شعر سمجھا دیتا ہے کہ اس محلے میں ہوش کا اسباب باہر رکھ کر جانا ہو گا، دروازے پر لکھا ہے:

پسِ وصال ٹھکانے حواس جب آئے
تو اس نے مجھ سے یہ پوچھا کہ آپ کب آئے

دروازے سے داخل ہوں تو جہان عجب ہے۔طرح طرح کی آوازیں ہیں، ایک آواز کہتی ہے؛

کچھ برف اور ڈالیے میرے گلاس میں

کوئی بے خود بیٹھا خود سے کہہ رہا ہے؛

وہ مرے ہاتھ کی پشت پر
میری تقدیر لکھتا رہا
بے خیالی بڑی چیز ہے
میں نے آخر اسے چھو لیا

کوئی اس حیرت میں مبتلا ہے کہ؛

ملبوس کر رہے ہیں نمایاں بدن کی آگ
گندم کی خو یہ آ گئی کیسے کپاس میں

ایک طرف سے یہ شکایت ابھرتی ہے؛

میں دے رہا ہوں سرہانے کو طول بازو سے
ابھی ترا مرے سینے پہ سر نہیں آیا

دوسری طرف سے آہ میں لپٹی صدا بلند ہوتی ہے؛

مجھ کو جو شے پسند آئی تھی
آگ تھی، آگ بھی پرائی تھی

کہیں واسوخت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی آواز بھی سنائی دیتی ہے:

کیا ہے تہذیبِ جنوں یہ معرفت تو ہو تجھے
تیرے پیچھے مجھ سے بڑھ کر کوئی دیوانہ پڑے

اس محلے کے لوگ ایسے خودمست ہیں کہ جنھیں کچھ پوچھنے کی بجائے انھیں غور سے دیکھ لینا ہی کافی ہے، سوانھیں ان کے حال پر چھوڑتے ہیں۔

اس لڑکھڑاتی اور ڈگمگاتی مخمور دنیا سے باہر نکلیں، ہوش کا سامان اٹھا کر واپس ہاتھ میں کریں، تھوڑے زیادہ قدم آگے بڑھیں تو اگلا دروازہ ہے لیکن یہ دروازہ پچھلے دروازوں سے مختلف اس طور ہے کہ یہ شکستہ ہے۔ اس پر لکھی عبارت اگرچہ مٹی مٹی سی ہے لیکن پڑھی جاتی ہے، ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵۔

دروازے کے اندر کی دنیا جراحتوں سے بھری ہے۔ سب سے پہلے ایک صدائے فقیرانہ آتی ہے:

چاہے دِلی ہو وہ کہ بالاکوٹ
شہر اجڑے تو استعارے ہوئے

اس کے بعد نوحے اور بین ہیں۔ حزن کی ایک لے جس کے پس منظر میں کرب کا ایک تسلسل ہے، کہیں اجتماع کا نوحہ ہے:

اب اپنے شہر میں اپنا تو اور کچھ بھی نہیں
بس ایک خیمہ ہے، یہ بھی اگر نہیں نہ سہی

کہیں دوست دار کی فریاد ہے:

مگر وہ تھا ہی نہیں اس لیے نہیں بولا
میں چیختا رہا مجھ کو پکار میرے یار

کہیں سب خاموش ہے، صرف دل بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

انگلیوں سے میں نے کھودی تھی لحد سی
ناخنوں میں دکھ کی مٹی بھر گئی ہے

میں نے بہ دقتِ تمام اس دروازے سے خود کو باہر نکالا ہے۔ نگاہ اُٹھتی ہے تو دروازے اور بھی ہیں لیکن ترتیب غلط ہو چکی ہے، اب کچھ اور دیکھنے کی ہمت نہیں۔ یاد رکھنا ہے کہ اگلی بار احمد کی شاعری کے جہان کی سیر کو آئیں تو اِس دروازے میں سب سے آخر میں داخل ہوں۔